

چند برس پہلے انسانی رویوں کے پھیکے پن سے آگیا گیا۔ ایسے گمان ہوتا تھا کہ ہمارے ملک میں منافقت، جہالت اور شدت پسندی اس درجہ کی ہے کہ اکثر لوگوں سے ملنا نہ صرف باعث آزار ہے بلکہ وقت کا زیاں بھی ہے۔ خیر اس معاشرہ میں جہاں ہر چیز تیرہ نمبر کی ہے، اس میں مہذب رویوں کی توقع کرنا صرف اور صرف حماقت ہے۔ تیرہ نمبر کا لفظ منیر نیازی استعمال کرتے تھے۔ اکثر کہتے تھے کہ کسی بھی چیز یا ملک کو دو نمبر کہنا دراصل ایک تعریفی جملہ ہے۔ کیونکہ دو نمبر ہمیشہ ایک نمبر کے نزدیک ہوتا ہے۔ لہذا دو نمبر کسی بھی صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں کرتا۔ اس معاشرے کیلئے تیرہ نمبر کا لقب بالکل مناسب ہے۔

خیر انسانی رویوں سے گھبرا کر پرندے، جانوروں اور پودوں پر وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو کچھ سمجھ نہ آیا۔ مگر آہستہ آہستہ مشاہدہ میں شدت آتی گئی۔ یہ ایک نئے جہان کی ابتداء تھی۔ ناقابل یقین حد تک خوبصورت اور دلچسپ۔ سرکاری گھر میں ایک چھوٹا سا لان ہے۔ وقت ملنے پر اس میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ کبھی علی الصبح اور کبھی شام کو۔ زندگی کی بے مقصد تیز رفتاری نے ہم سے بہت سی چیزیں چھین لی ہیں یا شاید چوری کر لی ہیں۔ اس رہزنی میں ہمارا قدرت کے ساتھ ملاپ اور لگاؤ بھی غائب ہو چکا ہے۔ مشاہدہ کی عادت تو خیر لٹ چکی ہے۔ پہلی کیفیت یہ تھی کہ ہم قدرت کے حسن سے بے خبر ہیں۔ آپ جہاں بھی رہتے ہیں جس طرح کے قصبہ، گھر، مکان، محلہ میں قیام پذیر ہیں۔ صبح کے وقت کسی کھلی جگہ پر بیٹھ جائیے۔ ایسا ایسا نایاب اور حسین پرندہ نظر آئیگا کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ ایک صبح پونٹھنے کے بعد، کمرے کی کھڑکی کے باہر ایک ایسی ننھی سی چڑیا دیکھی جس کے پروں میں چھ سے سات دلکش رنگ تھے۔ گہری نیلی اور فیروزہ دھاریاں موجود تھیں۔ چھوٹی سی گردن پر رنگ برنگے موتی سے بنے ہوئے تھے۔ چونچ گہرے سرخ رنگ کی تھی۔ دانہ دنگ کی تلاش میں یہ منفرد پرندے صرف اور صرف صبح کو نظر آتے ہیں۔ غور کرتا رہا کہ یہ پرندہ کیا کر رہا ہے بلکہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو غائب ہو چکا تھا۔ شاید کسی درخت کے تنے کے پیچھے یا کسی پودے کی آڑ میں بیٹھ چکا تھا۔ خوبصورت چڑیا کے ایک دم غائب ہونے سے مجھے ولیم ورڈزور تھ کی آفاقی نظم سمجھ آئی جو اس نے "the Cuckoo" کے عنوان سے صدیوں پہلے تحریر کی تھی۔ کیا نظم ہے۔ صاحبان کیا گہرائی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ زمانہ طالب علمی میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت تو قطعاً سمجھ نہیں آتی۔ ذہنی چنگلی کے عالم میں جب سمجھ آتی ہے تو اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ انسانی عمر کی شام کا وقت ہوتا ہے۔ اندھیرے سے تھوڑا پہلے۔ جس سرکاری کالونی میں رہتا ہوں وہاں درخت، پودے اور پرندے بہتات میں ہیں۔ ویسے تو سبزہ انسان کی نفسیات پر جادوئی کیفیت رکھتا ہے۔ مگر پرندے اس کیفیت کو مزید سحر انگیز کر ڈالتے ہیں۔ دو وقت ایسے ہیں جب یہ معصوم جادو گر اپنی موجودگی کا شدت سے احساس دلاتے ہیں۔ ایک علی الصبح، اپنے اپنے گھونسلوں سے اڑنے سے پہلے اور ایک شام کو، رات کی تاریکی سے قبل۔ حیران رہ جاتا ہوں کہ ان گنت پرندے جب بولتے ہیں تو ایک ایسا قدرتی نغمہ ترتیب ہوتا ہے جو دنیا کا عظیم ترین موسیقار بھی ترتیب نہیں دے سکتا۔ یہ قدرت کی فیاضی کا لمحہ ہوتا ہے۔ ہر شے سے پاک، صرف اور صرف قدرتی جمال کی انتہا۔ چڑیوں اور پرندوں کو صبح و شام کے وقت اس قدر خوش الحانی میسر آ جاتی ہے کہ میرے جیسا طالب علم صرف اور صرف سر دھن سکتا ہے۔ پرندوں کی آواز کو ریکارڈ کر کے ایک دوست کو سنائی۔ دوست موسیقی سے ظالم حد تک شغف رکھتا ہے۔ آوازوں کی چھبھاہٹ اور غنایت سے وہ حیران رہ گیا۔ دونوں ہی موسیقی کی انتہا ہیں۔ پرندوں کی خوشی، غمی اور گھائل ہونے کی کیفیت بھی صوتی اثرات میں نمایاں ہوتی ہے۔ انکی زبان تو خیر انسانی سمجھ سے باہر ہے۔ مگر انسانی ذہن نے اس پر بے مثال کام کیا ہے۔ جان یگ نے اپنی کتاب "What the Robin Knows" میں پانچ آوازوں کو قلمبند کیا ہے۔ انکے چمکنے پر لکھتا ہے کہ یہ مختلف پرندوں کی وہ آرام دہ آواز ہوتی ہے جب اپنے آپکو محفوظ سمجھتے ہیں۔ کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ یہ انکی بنیادی اور فطری آواز ہوتی ہے۔ جان یگ اسکو توازن اور اعتدال کی آواز کا نام دیتا ہے۔ اگر آپ جانوروں اور پرندوں کو خوفزدہ نہ کریں تو آپ سے ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ نزدیک اگر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپکو اپنی غیر موجودگی کا اس سے بہترین احساس کبھی نہیں ہو سکتا۔ شاید موجودگی اور غیر موجودگی کی کیفیت میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ بات صرف اور صرف ادراک کی ہے۔ سمجھنے کی ہے۔

چند ماہ قبل شوق ہوا کہ کچھ پرندوں کو صرف اس لیے پال لیا جائے کہ انکو بغور دیکھا جائے یا ان سے کچھ سیکھا جا سکے۔ جملے کا دوسرا حصہ انتہائی اہم ہے۔ تانہ لیا نوالہ میں اپنے چچا زاد بھائی کو کہا کہ چند مور مل سکتے ہیں۔ میرے کزن کو بچپن سے گورے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نام کی اہمیت اس درجہ ہے کہ میں گورے کے اصل نام سے ناواقف ہوں۔ سوچوں تو شاید یاد آجائے۔ گورے نے مجھے چار مور بھجوائے۔ دو سفید اور دو سبز اور نیلے رنگ کے۔ جب یہ پرندے میرے پاس تھوڑے دن رہے تو احساس ہوا کہ پنجرے میں رکھنا ظلم ہے۔ سراسر زیادتی ہے۔ انہیں کھلا چھوڑ دیا۔ دو چار ہفتوں میں وہ تمام اس قدر مانوس سے ہو گئے کہ سارا دن ادھر ادھر پھرنے کے بعد شام کو مغرب سے پہلے خود بخود پنجرے میں آ جاتے تھے۔ شاید رات کے اندھیرے کا خوف انہیں اپنے آپ کو محفوظ جگہ پر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ویسے انسانی رویہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ جیسے ہی خوف محسوس کرتا ہے، فوراً اپنی محفوظ پناہ گاہ میں چلا جاتا ہے۔ ویسے محفوظ تو پرندے نہ جنگل میں ہوتے ہیں نہ پنجرے میں۔ بالکل اسی طرح انسان بھی کسی پناہ گاہ میں محفوظ نہیں ہوتے۔ کہیں نہ کہیں کوئی درندہ گھات لگائے ضرور بیٹھا ہوتا ہے۔ شب خون مارنے کیلئے اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی باری آ جاتی ہے اور کبھی پنجرے کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے انسان اور پرندے دونوں تھوڑی دیر کیلئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ایک ماہ کے بعد محسوس ہوا کہ سبز اور نیلے رنگ کا ایک مور نقابت کا شکار ہے۔ کھانا پینا چھوڑ چکا ہے اور پنجرے سے باہر نہیں نکلتا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ لاہور میں جانوروں کا ایک بہت بڑا اور منظم ہسپتال ہے۔ یہ شاندار ہسپتال انگریز نے پاکستان بننے سے پہلے بنایا تھا۔ اسکے انگریزی نام کی اہمیت اپنی جگہ، مگر عرف عام اسے "گھوڑا ہسپتال" کہا جاتا ہے۔ اس میں تجربہ کار پروفیسر اور ڈاکٹر موجود ہیں۔ پرندوں اور جانوروں کا سرکاری علاج بہت اعلیٰ طریقے سے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں، کیونکہ انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔ انکے علاج معالجہ کیلئے معیاری ہسپتال نہیں ہیں۔ اس لیے جانوروں کے ہسپتال کی بات کرنی عبث ہے۔ بالکل بیکار۔ مور کو علاج اس نہ آیا۔ مزید کمزور ہوتا گیا۔ ایک دن گھاس پر آرام سے لیٹا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹوں میں پتہ چلا کہ مر چکا ہے۔ مجھے اس معصوم پرندے کی ذہنی کیفیت تو معلوم نہیں، پر اتنے سکون سے موت کو خوش آمدید کہتے کبھی نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے لا تعداد مریضوں کو دنیا سے دوسرے جہان میں جاتے ہوئے دیکھا رہا ہوں۔ بہت کم لوگ آسودہ موت کا شکار ہوتے ہیں۔ پرندے کے مرنے سے یہ سیکھا کہ دعا کرنی چاہیے کہ انسان سکون سے مر جائے۔ کسی پر بوجھ نہ بنے اور کسی کا محتاج نہ ہو۔ یہ ہماری دعا کا حصہ ہونا چاہیے کہ خدا اس طرح ہمیں اٹھالے کہ آنکھیں بند کریں اور کھیل ختم ہو جائے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ذہن ناک تو ہے ہی مگر یہ دکھ اور تکلیف کی انتہا بھی ہے۔ اس مور نے بڑی شائستگی سے جان دے دی، کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر۔ اب میرے پاس جو بقیہ مور ہیں، انکو بغور دیکھنا ایک بہت لطف بھرا لمحہ ہے۔

پرندے ایک موقع پر ایک دوسرے کی پروا نہیں کرتے۔ یہ وقت ان کے کھانے کا وقت ہے۔ کوئی پرندہ دوسرے کا انتظار نہیں کرتا۔ اسکی کوشش ہوتی ہے کہ سارا دانہ کھا جائے بلکہ دوسرے کے سامنے پڑی ہوئی روٹی کے ٹکڑے بھی کھا جائے۔ یہ عادت بالکل انسانوں جیسی ہے۔ معاشرہ پر نظر ڈالیے۔ ہر انسان کی نظر دوسرے کی دولت اور اسکی جیب پر ہے۔ کسی بھی مثبت یا منفی طریقے سے اپنی تجوری کو بھرنا ہماری خصلت بن چکی ہے۔ مگر پرندوں اور انسانوں میں اس حوالے سے ایک فرق بہت زیادہ ہے۔ پیٹ بھر جانے پر پرندے کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس جگہ سے چلے جاتے ہیں۔ مگر انسان ایسا نہیں کرتے۔ دولت جمع کرنے کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی ابتداء۔ مجھے اپنا مقتدر طبقہ تو آرزو دیدار نظر آتا ہے۔ جو اتنی دولت کمانے کے باوجود مزید کی ہوس میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں قناعت، پرندوں سے ضرور سیکھنی چاہیے۔ مگر یہ صرف اور صرف خواہش ہے۔

شاید ایک خواب۔ یہاں قناعت کا خاتمہ تو کب کا ہو چکا ہے۔ اسی اثناء میں یہ بھی اندازہ ہوا کہ لاہور میں انتہائی تعلیم یافتہ بلکہ تہذیب یافتہ لوگوں نے پرندوں اور جانوروں کا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ کاروبار کا لفظ درست نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے شوق کو روزی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ یہ جملہ کاروبار سے زیادہ مناسب ہے۔ ایک دکان پر گیا تو جنوبی امریکہ میں پائے جانے والے بڑے بڑے رنگدار پرندے نظر آئے۔ انتہائی قیمتی اور بیش قیمت۔ دکاندار اصل میں کمپیوٹر انجینئر تھا۔ پوچھنے پر بتایا کہ یہ مقامی سطح پر ہی مشین کے ذریعے انڈوں سے پیدا کیے گئے ہیں۔ انکا جنوبی امریکہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پاکستان میں ہر طرح کے پرندوں کے فارم موجود ہیں۔ شتر مرغ سے لیکر گھروں میں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے طوطوں تک۔ بہر حال یہ اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔ اگر سیکھنا چاہیں تو پرندوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مگر یہاں سیکھنے کا وقت اور جذبہ کس کے پاس ہے!